مہمان ریچھ

مائل خیر آبادیؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مہمان ریچھ

اب کی بار برسات ختم ہونے پر ٹھیکیدار صاحب نے جانے کی تیاریاں شروع کیں تو ساجد اور ساجدہ دونوں ضد کرنے لگے کہ ابا جان! ہم بھی چلیں گے۔ ہم نے کبھی جنگل نہیں دیکھا ہے۔ ہم نے ندی نہیں دیکھی ہے۔ ہم نے پہاڑ نہیں دیکھا ہے۔ کہانیوں میں نام سنا ہے۔ جنگلوں کے جانوروں کا نام بھی سُنا ہے لیکن دیکھا نہیں۔

بچّے ضد کرنے لگے تو ٹھیکیدار صاحب نے سمجھایا۔ ''ارے بھئی نہیں وہاں بڑی سردی ہوتی ہے۔ وہاں ملیریا بھی بہت جلد ہو جاتا ہے۔ جنگل کے جانوروں سے ہر وقت خطرہ رہتا ہے۔ پھر یہ کہ وہاں کھانے پینے کا انتظام بھی ٹھیک سے نہیں ہوتا۔ تم لوگ بہت پریشان ہو جاؤ گے۔ یہیں اپنی امّی کے ساتھ رہو۔ یہاں آرام سے رہو گے۔

''ہم امّی جان کو بھی ساتھ لے لیں گے۔'' دونوں بچّوں نے ایک ساتھ کہا تو امّی جو یہ سب دیکھ سُن رہی تھیں، بول اُٹھیں۔

''ٹھیک تو کہتے ہیں۔ اس بار میں بھی چلوں گی۔''

بیوی نے اس طرح کہا تو ٹھیکیدار صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ کہنے لگے۔ '' بھئی! بڑی کھکھیڑ کرنا پڑے گی۔

''کھکھیڑ آپ کو کیا کرنا پڑے گی۔'' امّی جواب دینے لگیں۔ ''کھکھیڑ تو مجھے کرنا ہوگی۔ وہاں آپ تو جنگل کو نکل جائیں گے۔ میں آپ کے لیے کھانے پینے کی سہولت پیدا کروں گی۔ آپ کو آرام ہی ملے گا۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ گھر سے نکل کر ذرا باہر کی دُنیا دیکھوں۔ پھر یہ کہ آپ جنگلات چلے جاتے ہیں تو دن رات آپ ہی میں دل لگا رہتا ہے۔''

ٹھیکیدار صاحب بڑے غور سے بیوی کی باتیں سنتے رہے پھر دیر تک کچھ سوچتے رہے۔ اس کے بعد بولے۔ اچھا تو انتظام کرو۔ اب کی بار بال بچّوں کے ساتھ رہ کر بھی دیکھوں کیا ہوتا ہے۔

لیجیے صاحب ساجد اور ساجدہ دونوں خوش ہو گئے۔ پھر جب ٹھیکیدار صاحب چلے تو ان کے ساتھ ان کا پورا گھر ساتھ تھا۔ بریلی سے کاٹھ گودام ریل سے گئے۔ وہاں سے ٹرک پر لد کر جنگل کے کنارے پہنچے۔ ساجد اور ساجدہ جنگل کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ جنگل کے کنارے اور اندر بہت سے مزدور کام کرتے دکھائی دیے۔ جگہ جگہ لوگوں نے سردی سے بچنے کے لیے آگ جلا رکھی تھی۔ درخت کاٹے جا رہے تھے۔ کٹی ہوئی لکڑی جنگل سے نکالی جا رہی تھی۔ یہ کام بیل گاڑیوں سے بھی ہو رہا تھا اور ٹرکوں سے بھی۔ بہت سے چٹّے لگ بھی چکے تھے۔ ٹھیکیدار صاحب نے جنگل کے کنارے ایک کمرہ اور برآمدہ بنا رکھا تھا اس کے سامنے تھوڑا سا احاطہ بنا دیا تھا وہ ہر سال اُسی میں جا کر رہتے تھے۔ اس سال اس پر ان کے گھر والوں نے قبضہ کیا۔ ٹھیکیدار صاحب کو اپنے دفتر کے لیے احاطہ کے باہر دوسرے مزدوروں کی طرح ایک جھونپڑا ڈالنا پڑا۔

وہاں پہنچ کر ٹھیکیدار صاحب تو لکڑی کٹوانے میں لگ گئے۔ ساجد اور ساجدہ جہاں جہاں مزدور کام کرتے وہاں کھیلنے جاتے۔ ان کی امّی احاطے کے اندر سے ان کو دیکھتی رہتیں۔ ان کی تاکید تھی کہ زیادہ دور تک کھیلنے نہ جائیں اور نہ جنگل میں ایسی جگہ جائیں جہاں کوئی نہ ہو یعنی کوئی آدمی نہ ہو۔

ایک دن ساجد اور ساجدہ جنگل میں گھوم پھر رہے تھے۔ چاروں طرف مزدور کام کر رہے تھے۔ کسی طرح کا ڈر نہ تھا۔ جنگل کے بڑے بڑے جانور جیسے ریچھ اور ایسے ہی دوسرے جانور خود ہی انسانوں سے دور رہتے ہیں۔ جنگل جیسے جیسے کٹتا جاتا ہے سارے جانور اور اندر چلے جاتے ہیں اور کبھی کبھی ہی کنارے آتے ہیں۔

اچھا تو ساجد اور ساجدہ گھوم پھر رہے تھے۔ اور شام تک گھومتے رہے۔ مغرب سے کچھ پہلے وہ احاطے کی طرف چلے۔ کچھ دور چلے تھے کہ تیز ہوا چلنے لگی۔ دونوں نے جلدی جلدی چلنا شروع کر دیا۔ ہوا اور تیز ہو گئی۔ دونوں نے دوڑنا شروع کر دیا دوڑنے میں ساجدہ پیچھے رہ گئی تو ساجد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس طرح دونوں احاطے کی طرف بھاگے مزدور ان کو دیکھ کر ہنستے تھے۔

کچھ ہی دور چلے تھے کہ بوندا باندی شروع ہو گئی۔ ساتھ ہی سردی بھی بڑھ گئی لیکن اب وہ احاطے کے پاس پہنچ گئے تھے ان کی امّی ان کے لیے بے قرار تھیں بچّے پہنچے تو ان کی بے چینی دور ہوئی۔

وہ تو بچّوں کو لے کر کمرے میں جا گھسیں۔ کمرے میں انگیٹھی دہک رہی تھی۔ انگیٹھی کے آس پاس ماں اور بچّے بیٹھ گئے۔ ٹھیکیدار صاحب ابھی آئے نہیں تھے چائے کے لیے پانی بھی رکھ دیا گیا

تاکہ ٹھیکیدار صاحب کے آتے ہی چائے پی جائے۔ ہوا کی وجہ سے کمرے کے دروازے کے کواڑ دھڑ پڑ ہو رہے تھے۔کنڈی لگا دی گئی۔

مغرب کے بعد ایک گھنٹہ ہو گیا۔ ہوا اب تھم چکی تھی، اور بارش بھی۔ٹھیکیدار صاحب ابھی نہیں آئے تھے۔کمرے میں ماں اور بچے سب ان کا انتظار کر رہے تھے۔کچھ دیر کے بعد کسی نے کواڑوں کو دھکّا دیا۔ ’’آ گئے‘‘ سب کی زبان سے نکلا۔ساجد کنڈی کھولنے دوڑا۔اس نے جاتے ہی کنڈی کھول دی۔پھر جب کواڑ کھول کر سامنے دیکھا تو چیخ کر بھاگا۔

’’ہائے امّی ریچھ!‘‘ کمرے میں بیٹھے ہوئے سب لوگ بدحواس ہو گئے۔لیکن ریچھ چپکے سے اندر آیا اور انگیٹھی کے پاس اس طرح بیٹھ گیا جیسے وہ ان کا کوئی مہمان ہو۔اس نے کچھ بھی تو نقصان نہیں پہنچایا۔ نہ غرّایا۔یہ دیکھ کر کچھ ڈھارس بندھی ماں نے بچوں کو کمبل میں چھپا لیا تھا اور سوچ رہی تھی کہ کیا کرے۔

اُسے بڑا تعجب ہوا جب اس نے دیکھا کہ ریچھ نے اس کی طرف ہاتھ پھیلایا جیسے وہ کچھ مانگ رہا ہو۔تو اس نے بچّوں کے لیے رکھا ہوا بسکٹ دیدیا۔بسکٹ کھا کر اس نے کیتلی کی طرف کچھ اس طرح اشارہ کیا جیسے وہ چائے مانگ رہا ہو۔اب سب کا ڈر بھی کم ہو گیا تھا۔ریچھ کا مطلب سمجھ کر کیتلی میں چائے ڈالی گئی۔ریچھ دیکھتا رہا۔پھر ایک بڑے پیالے میں دودھ شکر اور چائے کا پانی ڈالا۔اس میں ایک بسکٹ اور ڈالا۔ پھر ریچھ کی طرف بڑھا دیا۔ریچھ سُڑ سُڑ چائے پینے لگا۔

بچّوں کو بھی چائے دی گئی لیکن ان کے لیے حکم تھا کہ کمبل کے اندر ہی پئیں۔ساجد اور ساجدہ کمبل کے اندر پیالی رکھ کر پینے لگے۔چائے تھی گرم۔ پہلا گھونٹ لیا تو اُچک پڑے۔اُچکے تو چائے چھلک گئی ’’اوئی اللہ‘‘ ساجدہ چلاّئی۔اس کے اوپر چائے گر گئی تھی۔وہ ایک طرف کھسکی تو ریچھ اُسی طرف دیکھنے لگا۔ریچھ نے ساجدہ کو دیکھا چھپ چھپ پلکیں ماریں اور ساجدہ کے قریب ہو بیٹھا اور اپنا پیالہ بھی گھسیٹ لیا۔ساجدہ نے اپنی چائے اس کے پیالے میں ڈال دی اور ساتھ ہی ریچھ کو چھوا۔ریچھ کچھ نہ بولا تو ساجد نے بھی اپنی چائے اس کے پیالے میں ڈال دی اور اس نے بھی اُسے چھوا۔اور چھوّا۔اور پھر چھوّا۔ریچھ نے کچھ نہ کہا تو دونوں کمبل سے باہر آ گئے۔ ماں نے گھور کر دیکھا۔اسی وقت ٹھیکیدار صاحب آ گئے۔کمرے کے اندر قدم رکھتے ہی چونک پڑے لیکن سب کو خیریت سے دیکھا اور ریچھ کو چائے پیتے پایا تو اطمینان ہوا۔

ٹھیکیدار صاحب کو دیکھ کر ریچھ اُٹھا اور باہر چلا گیا۔

اللہ تیرا شکر ہے‘‘ کہہ کر امّی نے جھٹ کنڈی لگا دی۔ٹھیکیدار صاحب سے کہنے لگیں۔’’اگر یہ ریچھ حملہ کر بیٹھتا تو کیا ہوتا؟‘‘

''وہی ہوتا جو اللہ کو منظور ہوتا۔''

''ہائے اللہ میرا تو دم ہی نکل گیا تھا۔''

''بات یہ ہے'' ٹھیکیدار صاحب کہنے لگے کہ ''ان جانوروں کو ستاؤ نہیں تو یہ نقصان نہیں پہنچاتے بلکہ ہل مل جاتے ہیں۔ مگر خطرہ ان سے ہر وقت رہتا ہے اب کبھی ایسا ہو تو سمجھ بوجھ کر کواڑ کھولا کرو۔ میرا خیال ہے کہ ریچھ یہاں کسی کو نقصان پہنچانے نہیں آیا تھا بلکہ سردی اور بارش سے بچنے کے لیے آیا تھا۔ پھر جب تم نے اس کی خاطر داری شروع کر دی تو بھائی سچّی بات یہ ہے کہ احسان تو جانور بھی مانتے ہیں۔

یہ کہہ کر ٹھیکیدار صاحب نے سب کے ساتھ کھانا کھایا۔ چائے پی پھر سب سو گئے۔ دوسرے دن جنگل کی بہار دیکھنے کے لائق تھی۔ پیڑ پودے دُھل کر نکھر گئے تھے۔ جگہ جگہ پانی بھرا ہوا تھا۔ گرد کا تو کہیں نام بھی نہ تھا۔ ساجد اور ساجدہ دوسرے دن سیر کو نکلے تو آپس میں کہنے لگے۔ ''آؤ اس ریچھ کو ڈھونڈیں۔''

بچّوں کی باتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ اس وقت ریچھ کہاں۔ وہ کہیں کا کہیں پہنچ گیا ہوگا۔ مگر یہ دونوں اس کی دھن میں ایک طرف نکل گئے ـــــ وہ بہت دور نکل گئے۔ اس طرف جہاں مزدور کام نہیں کر رہے تھے۔ اس طرف جنگل گھنا تھا۔ وہاں انھوں نے جگہ جگہ چڑیوں کے چھوٹے بڑے انڈے پڑے دیکھے۔ اُنھوں نے انڈے اُٹھا اُٹھا کر کُرتے میں رکھنا شروع کر دیے۔

انڈے اٹھانے کی دُھن میں ان کو یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا کہ جنگل سے ایک آدمی پیچھے سے ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے کندھے پر ایک بڑا سا بورا تھا۔ اس نے پہلے ساجد کو جھپٹ کر پکڑا۔ اس کا منھ بند کر کے بورے میں ڈال لیا اس کے بعد ساجدہ کی طرف جھپٹا۔ ابھی وہ ساجدہ کے پاس نہ پہنچا تھا کہ ایک طرف سے ایک بھالو آیا اور اس نے پیچھے سے اس جنگلی آدمی کو پکڑ لیا جو ساجد کو بورے میں رکھ چکا تھا اور ساجدہ کے قریب پہنچ چکا تھا۔

ریچھ نے اس آدمی کو پکڑا ساتھ ہی اس کی گردن منہ میں بھر لی تو وہ بچّہ چور چیخ پڑا۔ بورا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ریچھ اس کی گردن پکڑے ہوئے تھا اور اب ساجدہ ڈر کے مارے چیخ رہی تھی۔ بورے کو دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ ساجد اس میں ہے اس نے جا کر بورے کا منہ کھول دیا۔ ساجد اندر سے نکلا۔ اس نے اپنے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکالا۔ پھر دونوں شور کرنے لگے۔ انھوں نے ریچھ کو پہچان لیا۔ یہ وہی ریچھ تھا جو رات کو ان کا مہمان رہ چکا تھا۔

پھر تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ بچّوں کا شور سُن کر لوگ آ گئے ہوں گے اور پھر وغیرہ وغیرہ۔ کہو کیسی مزیدار رہی یہ کہانی۔

شریف

نام تو اس کا شریف تھا لیکن بس وہ نام کا شریف تھا۔ سچّی بات یہ ہے کہ وہ بڑا شریر تھا۔ نت نئی شرارتیں اسے سوجھا کرتیں۔ وجہ جاتیں اللہ تعالیٰ نے اُسے بڑا اچھا ذہن دیا تھا لیکن وہ اپنے اس ذہن سے بھلے کام سوچنے کے بدلے بُرے کام سوچا کرتا۔ اور پھر کوئی نہ کوئی شرارت کر بیٹھتا۔ اس کی امّی اس سے بہت پریشان تھیں۔ اُس کے ابّا تو اس سے خفا ہی رہتے اور جب کوئی اس کی شکایت لے کر آتا تو وہ شریف کو پیٹ دیا کرتے تھے۔ یہی شریر لڑکا عجیب وغریب طریقے سے سچ مچ شریف بن گیا۔ کیسے شریف بن گیا؟ یہی بات اس کہانی میں بتائی گئی ہے۔

ہوا یہ کہ آموں کا زمانہ تھا۔ شریف کا اسکول بند تھا۔ چھٹی کے دن تھے۔ جون کے دوسرے ہفتے میں بارش کا پہلا پانی برس چکا تھا اور آم پکنے لگے تھے۔ پیلے پیلے اور رسیلے آم درختوں میں جھول رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر بڑے بڑوں کے منہ میں پانی بھر آتا تھا تو بھلا بیچارے شریف کی کیا حیثیت تھی۔ ایک بار وہ سیر کو اکیلا ہی نکلا۔ سوچا تھا کہ کسی دوست کو لے کر کہیں کھیلے کودے گا۔ اتفاق سے اُسے کوئی دوست نہ ملا۔ شوکت چھٹیوں میں اپنی نانی کے گھر گیا ہوا تھا۔ شکیل اپنے باپ کے ساتھ اپنے گھر آرام پور چلا گیا تھا۔ محمود گھر پر نہیں ملا۔ اسی طرح وہ کئی دوستوں کے گھر گیا لیکن جب کوئی نہ ملا تو تنِ تنہا ایک نکل گیا۔

زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ اس نے سامنے ایک چھوٹا سا باغ دیکھا۔ اس باغ میں چودہ پندرہ آم کے پیڑ تھے۔ پیڑ سب پھلوں سے لدے تھے۔ کچے پکّے ہرے پیلے آم لٹک رہے تھے۔ بیچ باغ میں ایک جھونپڑی پڑی تھی۔ شریف باغ کے اندر گیا۔ اندر جا کر اس نے جھونپڑی کے اندر دیکھا۔ اندر کوئی نہ تھا۔ اب تو اس کی بن آئی۔ اس نے باغ میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ بہت سے پکّے پکّے، پیلے پیلے آم پیڑوں کے نیچے ٹپکے پڑے تھے۔ شریف کو افسوس ہو رہا تھا کہ تھیلا ساتھ کیوں نہ لیتا آیا۔ پھر بھی اس نے

وقت ضائع نہیں کیا۔ اس نے آم اُٹھا اُٹھا کر کُرتے میں بھرنا شروع کر دیے۔ وہ آم اکٹھا کرنے میں ایسا کھویا کہ اسے یہ بھی خبر نہیں ہوئی کہ کب کوئی باغ میں آیا۔ وہ شروع شروع میں تو چوکنّا رہا۔ اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر یہ سب بھول گیا۔ اُسے تو اس وقت خبر ہوئی جب کسی نے پیچھے سے آ کر اچانک اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ شریف چونک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ ایک بوڑھی عورت عینک لگائے اس سے پوچھ رہی تھی۔

''کیا نام ہے تیرا؟'' بوڑھی عورت غصّے میں تھی۔ شریف اچانک پکڑ جانے پر گھبرا گیا۔ انسان جب گھبرا جاتا ہے تو اس کی سمجھ کام نہیں کرتی۔ یہی حال شریف کا ہوا۔ وہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ حالاں کہ وہ بھاگنا چاہتا تو بوڑھی عورت کو دھکّا دے کر بھاگ سکتا تھا۔ وہ اس طرح ہکّا بکّا رہ گیا کہ کُرتے کا دامن اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا اور سارے آم زمین پر بکھر گئے۔ بوڑھی عورت نے پھر پوچھا:

''تیرا نام کیا ہے رے؟''

''میرا نام شریف ہے'' اور اب وہ سنبھل رہا تھا۔

''اور تیرے باپ کا نام؟''

''عبدالحق چودھری۔'' اور اب شریف کا ذہن کام کرنے لگا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور پھر جھٹ سے مڑ کر بھاگا۔

''اچھا تیرے باپ سے کہوں گی۔'' شریف نے بھاگتے بھاگتے سنا۔ وہ بھاگتا جا رہا تھا اور سوچتا جا رہا تھا کہ اگر بوڑھیا نے باپ سے شکایت کر دی تو پھر آج پٹائی ہوگی، وہ باپ کے ہاتھوں پٹنے سے بچنے کے لیے تدبیریں بھی سوچتا جا رہا تھا۔ جس وقت وہ گھر میں پہنچا اس کے کپڑے بڑے گندے تھے اور کرتے کا آگے کا دامن تو آموں کے رکھنے سے بہت خراب ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا، ابّا جان کے آنے سے پہلے نہا دھو کر صاف کپڑے پہن لینا چاہیے۔ وہ امّی کے پاس گیا اور اس نے کپڑے مانگے۔ کپڑے دینے کے لیے وہ جیسے تیّار ہی تھیں۔ بولیں۔ ''تیرے ابّا تجھے بلا گئے ہیں۔ جلدی نہا کر کپڑے بدل لے اور جا!''

''کہاں امّی؟''

''امیر احمد صاحب کے یہاں بُلایا گیا ہے۔''

شریف خوش ہو گیا۔ غسل کر کے اور کپڑے بدل کر امیر احمد صاحب کے مکان کی طرف چل دیا۔ راستے میں گلی کے ایک موڑ پر اچانک اسی بوڑھی خاتون سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔ اُسے دیکھ کر شریف جھجکا بھی اور ٹھٹکا بھی۔

''میں تمہارے باپ کے پاس جارہی ہوں۔تمہارا نام شریف ہے نا!'' بوڑھی عورت عینک درست کرتے ہوئے اُسے گھورنے لگی۔شریف تو بڑا ذہین تھا مگر وہ جو ہم نے پہلے کہا نا! کہ اس کی ساری ذہانت شرارت کے کاموں میں کام کرتی تھی۔اس نے کہا:۔

''نہیں مائی! میرا نام شریف نہیں، میں تو ساجد ہوں۔''شریف میرا جُڑواں بھائی ہے۔''

''ہاں، اسی لیے تمہاری شکل اس سے ملتی ہے۔تم تو بہت صاف ستھرے ہو۔شریف تو بڑا گندہ ہے۔''

''بہت سے لوگ ہم دونوں کو دیکھ کر دھوکا کھا جاتے ہیں۔''شریف نے شک دور کرنے کے لیے یہ جملہ بھی کہا۔

''ٹھیک ہے۔بس ذرا اس کے کان تم سے بڑے ہیں۔''

''ہاں۔آپ نے خوب پرکھا۔آپ نے عینک کہاں سے خریدی تھی؟''

بوڑھی عورت نے اس کا جواب تو نہ دیا۔ وہ پھر بتانے لگی کہ شریف آج میرے باغ میں چوری کرنے گیا تھا۔تم جانتے ہو ساجد! اور سنو ساجد! تم اپنا نام شریف رکھ لو اور اس کا نام یہ رکھ دو ـــــ اچھا خیر۔اللہ کرے شریف سچ مچ شریف بن جائے تو سنو ساجد! چوری کرنا تو بہت بُری بات ہے نا!''

''بہت بُری بات ہے مائی!'' شریف نے بڑے بھولے پن سے کہا۔

''اور چور سے اللہ میاں بہت ناراض ہوجاتے ہیں۔تم جانتے ہو نا!''

''بہت ہی خفا ہوتے ہیں۔''شریف نے پھر اسی لہجے میں کہا:۔

''اور اللہ میاں کو ناراض کرنے والا جہنمی ہوتا ہے!''

''اُف میری توبہ! سچ مچ چور جہنم میں جائے گا۔'' شریف نے اپنے گال تھپتھپائے۔

''تو میں شریف کے باپ! ہاں ہاں! تمہارے ابا جان سے کہوں گی کہ وہ اپنے بال بچوں کو جہنم کی آگ سے نہیں بچاتے؟''

''بچاتے ہیں مائی! وہ بہت نصیحت کرتے ہیں مگر شریف پر اثر نہیں ہوتا۔'' شریف نے پھر جھوٹ بول دیا۔ساتھ ہی اسے بھولی بڑھیا کی باتوں میں مزہ بھی آنے لگا۔

''اس شریر نے گھر تو بتایا نہ ہوگا کہ آج اس نے میرے باغ میں چوری کی تھی۔

''گھر میں تو کسی سے نہیں بتایا۔اُسے ڈر ہے کہ ابّا جان کو خبر ہوگئی تو وہ پیٹ کر رکھ دیں گے۔ ہاں اس نے مجھ سے کہا۔''

''کیا کہا؟''

''اس نے کہا کہ جا کر بوڑھی نانی سے سفارش کر دو کہ وہ مجھے معاف کر دیں۔ اب میں چوری نہ کروں گا۔''

''تو کیا تم میرے پاس ہی جا رہے تھے۔ اللہ تمہارا بھلا کرے۔''

''جی ہاں، میں آپ ہی کی خدمت میں جا رہا تھا۔ آپ ابّا جان سے اس کی شکایت نہ کریں۔''

بوڑھی عورت کا دل شریف کی بناوٹی باتوں سے پگھل گیا۔ اس نے کہا:۔

''معلوم ہوتا ہے تمہارے ابّا بڑے اچھے آدمی ہیں۔ ان کو اس خبر سے بڑا دکھ ہوگا اور تم اپنے ماں باپ کو دکھی نہیں دیکھ سکتے۔''

''جی ہاں! یہ بات بھی ہے اور یہ بھی کہ مجھے میرا بھائی بھی پیارا ہے۔'' شریف نے رنج کے لہجے میں کہا۔ دکھانے کے لیے رومال آنکھوں پر رکھ لیا تاکہ عورت سمجھے کہ وہ روہانسا ہو گیا ہے۔''

''تم بڑے اچھے بیٹے ہو۔ تم کو اپنے ماں باپ سے محبّت ہے۔ اپنے بھائی بہنوں سے محبت ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تم جھوٹ تو نہیں بولتے ہو؟''

''جھوٹ بولنا تو حرام ہے مائی! جھوٹ بولنے والا بھی تو جہنّمی ہوتا ہے۔''

''اور نماز پڑھتے ہو؟''

''نماز! باجماعت نماز پڑھتا ہوں۔''

''تو پھر سچ مچ تم سچّے ہو۔ اچھا میں تمہاری سفارش پر شریف کو معاف کرتی ہوں۔ اچھّا میں چلی۔''

یہ کہہ کر بوڑھیا واپس ہو گئی۔ وہ اپنی لٹھیا ٹیکتی جا رہی تھی۔ شریف دو منٹ اُسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ امیر احمد صاحب کے مکان کی طرف چل دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ بوڑھیا کو آج کیسا بیوقوف بنایا۔ کیسا چکمہ دیا۔ اسی لیے تو شوکت مجھے بڑا ذہین کہتا ہے۔

دن بھر کے کاموں سے چھٹی پا کر جب شریف اپنی چارپائی پر لیٹا ہوا بوڑھیا کو یاد کر رہا تھا تو اپنی چال پر بہت خوش ہو رہا تھا اس نے دل ہی دل میں کہا۔ اس بوڑھیا کو چکمہ دینا کیا بڑی بات ہے۔ پھر جب وہ یہی سوچتے سوچتے سو گیا تو خواب میں وہی آموں کا باغ دیکھا۔ خواب ہی میں اس نے بہت سے آم اکٹھا کیے اور کھائے بھی۔ آم اُسے بڑے مزے کے لگے۔ صبح کو جب وہ سو کر اٹھا تو خواب کی باتیں بار بار اُسے یاد آ رہی تھیں۔ دس بجے تک تو جیسے تیسے وُہ رُکا رہا۔ پھر جیسے ہی اُس کے ابّا دفتر کو گئے وہ آم کے باغ کی طرف چل دیا، اس نے سوچا کہ بوڑھیا ہی کے باغ میں چلنا چاہیے۔ وہ دیکھ بھی لے گی تو پکڑ نہ سکے گی۔ پھر اس کی شکایت سے بچنے کی تدبیر سوچ لی جائے گی۔

وہ باغ میں پہنچا۔ باغ میں جا کر سب سے پہلے اس نے جھونپڑی میں جھانکا۔ بوڑھیا اندر بیٹھی پوپلے منھ سے آم چوس رہی تھی۔ شریف کو ہنسی آگئی۔ اس نے ہنسی کو روکا اور پھر پلٹ کر ایک درخت کے نیچے آم اٹھانے اور تھیلے میں رکھنے لگا۔ آج وہ تھیلا ساتھ لایا تھا۔

نہ جانے بوڑھیا کو شبہ ہو گیا یا کیا۔ وہ گٹھلیاں اور چھلکے لیے جھونپڑی سے نکلی۔ ایک لڑکے کو آم سمیٹتے دیکھا تو ڈانٹا۔ ''کون ہے رے؟'' ڈانٹ سن کر شریف نے مُڑ کر دیکھا اور بھاگا۔

''پہچان لیا۔ پہچان لیا۔ آج میں تیرے باپ سے ضرور کہوں گی۔''

شریف نے سنا تو مگر وہ تو اس وقت بس بھاگ رہا تھا۔ وہ گھر پہنچا تو ماں نے کہا۔

''کھانا کھا لو اور یہ بتاؤ دوپہر کو گھر پر رہو گے؟ میں ذرا تمہاری خالہ کے یہاں ہو آؤں۔ بس گھنٹہ بھر میں آجاؤں گی۔''

''ضرور جائیے۔ میں گھر پر رہوں گا۔''

''اس تھیلے میں کیا ہے؟''

''امّی آم لایا ہوں۔''

''کتنے کے ہیں یہ؟''

''آٹھ آنے کے!'' اس نے کہنے کو تو کہہ دیا۔ آٹھ آنے کے۔ لیکن اُسے اپنی غلطی محسوس ہوگئی۔ تین چار کلو آم کہیں آٹھ آنے کے ملتے ہیں۔ اس نے پھر کہا ''امی جان! یہ تخمی آم ہیں۔''

مگر امی جان کو اس وقت اتنی فرصت کہاں کہ زیادہ جانچ پڑتال کرتیں۔ وہ برقع اوڑھ کر چل دیں۔ شریف نے سوچا۔ اس عرصے میں بوڑھیا آئے گی تو گھر میں کسی کو نہ پا کر لوٹ جائے گی۔ اس کے بعد ــــــ ؟

اس کے بعد وہ عصر کے بعد شاید آئے۔ تو مجھے کیا کرنا چاہیے وہ سوچتا رہا سوچتا رہا۔ اچانک اس کی زبان سے نکلا۔ ''وہ مارا'' ترکیب اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے کچھ آم جو کھانے سے بچ رہے تھے۔ تھیلے میں ڈالے۔ امّی واپس آئیں تو ایک دوست کے گھر جانے کا بہانہ کر کے چل دیا۔ گھر سے نکل کر وہ باغ کی طرف مڑ گیا باغ کے سامنے پہنچا تو بوڑھیا کو اسی طرف آتے دیکھا۔ وہ کھڑا ہو گیا بوڑھیا قریب آئی تو اس نے بلند آواز سے کہا۔

''السّلام علیکم!''

''اللہ جیتا رکھے۔ اللہ عمر دراز کرے۔'' اور یہ کہتے کہتے بوڑھیا سیدھی ہوئی۔ اور اس نے اپنی عینک ٹھیک کر کے اسے دیکھا تو بولی۔

آج پھر تمہارے شریر بھائی نے مجھے ستایا۔ آج وہ چوری کر کے آم لے بھی گیا آج میں تمہاری سفارش نہیں سنوں گی۔ تم میرے ساتھ چلو۔"

"میں آپ کے ساتھ ضرور چلوں گا مگر میری ایک بات سُن لیجیے۔"

"کیا؟"

"میں نے کل اسے بہت سمجھایا تھا۔ اس نے وعدہ کیا تھا مگر آپ جانتی ہیں کہ اس کی عادت چھوٹتے چھوٹتے چھوٹے گی۔ وہ ذرا چٹورا بھی ہے۔ آج وہ چوری کر تو بیٹھا مگر میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ جب وہ گھر پہنچا تو مجھے دیکھ کر بہت شرمایا۔ اس نے سارے آم مجھے دیدیے اور کہا کہ مائی جی سے آج اور معافی دلا دو۔ تو لیجیے، یہ ہیں آپ کے آم اور آج اور معافی دید یجیے۔"

"ارے ساجد! تو کتنا بھولا ہے۔ شریف بغیر پٹے سیدھا نہ ہوگا۔"

"مائی! تین خطائیں تو اللہ میاں معاف کر دیتے ہیں۔ تم کیا دو خطائیں معاف نہ کرو گی"

"تجھے دیکھ کر میرا جی خوش ہو جاتا ہے۔ میں تجھے تو اپنا بیٹا بنالوں گی مگر شریف کو ضرور پٹوادوں گی۔"

"ہونھ، چلی ہیں بیٹا بنانے۔ بیٹے کی ایک بات تو مانتی نہیں!"

شریف کا یہ داؤں چل گیا۔ بوڑھیا نے کہا" اچھا بیٹا آج اور معاف کر دیا لیکن اگر وہ اب کبھی آیا تو نہیں بخشوں گی۔"

"بس ٹھیک ہے۔ اب کی بار تو میں خود اسے پکڑ کر باپ کے پاس پیش کر دوں گا۔"

"اچھا تو یہ آم تو خود کھالے۔ شریف کو ایک مت دینا۔" اور یہ کہہ کر بوڑھیا واپس اپنی جھونپڑی کی طرف چل دی اور شریف کھڑا کھڑا مسکراتا اور اُسے دیکھتا رہا۔

شریف لوٹ کر گھر آیا تو ماں نے بتایا، کل صبح ہی صبح تمہاری خالہ کے گھر ملانی بی کا وعظ ہے۔ ایسے ہی صاف ستھرے کپڑے پہن کر چلنا۔ میلے نہ کرنا۔ اچھے بچّے کپڑے میلے نہیں کرتے۔ اور دیکھو نماز بھی پڑھا کرو۔ اچھے بچے نماز بھی پڑھتے ہیں۔ اور دیکھو سچ بولا کرو۔ اچھے بچّے سچ بولا کرتے ہیں۔ ہاں بیٹے شاباش!"

شریف ہوں ہوں، جی جی کرتا رہا۔ پھر جب امی دوسرے کاموں میں لگ گئیں تو شریف بھی کھیل کود میں سب کچھ بھول گیا۔ ہاں، جب وہ رات کو سونے کے لیے لیٹا تو اسے بار بار یہ خیال آرہا تھا کہ اس بوڑھی خاتون (آموں والی) نے بھی مجھ کو اچھا بچہ سمجھا اور پوچھا تھا کہ نماز پڑھتے ہو، جھوٹ سے بچتے ہو اور صاف ستھرے تو رہتے ہی ہو امّی بھی اچھے بچّے کی یہی پہچان بتاتی ہیں۔ کیوں نہ میں اچھا بچہ ہی بن جاؤں۔

یہ سوچتے سوچتے وہ سو گیا۔ سوتے میں اس نے نہ جانے کیا خواب دیکھا کہ وہ بڑبڑایا۔ ''میں اچھا بچہ بنوں گا۔ پھر جب وہ صبح کو جاگا تو امّی نے یاد دلایا۔

''بیٹا خالہ کے گھر چلنا ہے۔ ملّانی بی کا وعظ ہوگا۔ ملّانی بی ہر ایک سے نماز کے بارے میں پوچھتی ہیں۔ شاید تم سے بھی پوچھیں اگر تم پڑھ لو تو سچ بول سکتے ہو ورنہ سچ بولنا تمہارے لیے مشکل ہو جائے گا۔

ماں کے کہنے سے شریف نے نماز پڑھی، نماز پڑھ کر اسے ایسا لگا جیسے وہ اپنی نظر میں اچھا بچہ بن گیا ہو۔ اس نے دل میں کہا۔ ''تو پھر کیوں نہ اچھا بچہ ہی بننے کی کوشش کروں۔ مگر ایک مشکل ہے۔ اچھا بچہ بننے کے لیے سچ بولنا بھی پڑے گا۔ سچ بولنا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے، سچ بولنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اپنے منہ سے اپنا پول کھولوں اور پھر دوسروں کے سامنے شرمندہ ہوں یا پھر سچ بول کر پٹوں یا پھر سبھی اچھے کام کروں اور سارے ہی اچھے کام کرنا میرے بس میں نہیں۔ ایک بار جھوٹ بول دینے سے سارے عیب چھپ جاتے ہیں۔

وہ اسی طرح سوچتا رہا کہ خالہ کے یہاں جانے کا وقت ہو گیا۔ وہ امّی کے ساتھ خالہ کے یہاں گیا وہاں وعظ شروع ہو چکا تھا۔ وعظ اس کی سمجھ میں کچھ یونہی سا آیا۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ سن سکا کہ تم بندوں سے تو اپنے عیبوں کو چھپا سکتی ہو لیکن اللہ سے نہیں چھپا سکتیں۔ تم جھوٹ بول کر بندوں کو تو خوش کر سکتی ہو لیکن اللہ کو خوش نہیں کر سکتیں۔ دراصل تم کو اللہ کی خوشی کے لیے سارے کام کرنا چاہئیں۔ چاہے ان کے کرنے سے تمہارا نقصان ہو۔ اس نقصان کے بدلے اللہ تعالیٰ آخرت میں تم کو جنت عطا فرمائے گا۔

ملانی بی کے وعظ میں اس طرح کی باتیں بار بار سننے میں آئیں۔ اس نے سنا کہ ملانی بی نے قرآن کی آیتیں بھی پڑھیں اور حدیثیں بھی اور ان کا ترجمہ بھی پیش کیا۔ ابھی وعظ ختم نہیں ہوا تھا کہ شریف نے ایک بوڑھیا عورت کو لٹھیا ٹیکتے آتے دیکھا وہ اسے دیکھ کر گھبرانے لگا۔ بوڑھیا کو دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ وہ بھاگ جائے لیکن اس نے دیکھا کہ بوڑھیا اس پر ایک نظر ڈال کر اسی کی طرف بڑھی چلی آرہی ہے۔ اب وہ بھاگ نہ سکا۔ مجبور ہو کر اس نے اسے سلام بھی کیا۔ بوڑھیا اسی کے پاس بیٹھ گئی۔ اور اس نے ''ساجد بیٹا'' کہہ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور بیٹھ کر وعظ سننے لگی۔

وعظ ختم ہونے کے بعد امّی نے پوچھا۔ ''یہ کون بزرگ خاتون ہیں؟'' شریف ابھی کچھ کہہ نہ سکا تھا کہ بوڑھیا خود کہنے لگی۔ ''میں اس کی ماں ہوں۔ تم بتاؤ، تم اس کی کون ہو؟''

شریف کی ماں مسکرائیں۔ انھوں نے کہا۔ ''میں بھی اس کی ماں ہوں مگر تم اس کی ماں کیسے ہو گئیں؟''

اب شریف کے لیے یہ وقت بڑا کٹھن تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اب پول کھلنے ہی والا ہے۔ اسے ملانی

بی کے وعظ کے الفاظ یاد آئے۔ ''تم بندوں سے جھوٹ چھپا سکتے ہو مگر اللہ سے نہیں چھپا سکتے۔''

اس نے ان جملوں پر غور کیا تو اس کی سمجھ میں آیا کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک نہ ایک دن جھوٹ کھل کر رہتا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں خدا سے کہا۔ ''اے اللہ! آج میری لاج رکھ لے۔ میرے عیب کو چھپا لے۔ میں اب نماز بھی پڑھوں گا اور جھوٹ سے بچوں گا اور چوری بھی نہ کروں گا۔''

ادھر بوڑھیا شریف کی امّی کو بتا رہی تھی کہ تمہارا یہ بیٹا ساجد بڑا اچھا بیٹا ہے۔ اس کو تم سے اور تمہارے میاں سے بڑی محبت ہے اور اس کا جوڑواں بھائی شریف ہے جو بڑا شریر اور چور ہے اس سے بھی محبت ہے۔ شریف نے میرے باغ میں آم چرائے لیکن اس پیارے ساجد کو معلوم ہوا تو اس نے اسے سمجھایا لیکن وہ نہ مانا۔ بہن تمہارا وہ بیٹا جس کا نام شریف ہے بڑا شریر ہے لیکن یہ ساجد نماز پڑھتا ہے، سچ بولتا ہے، چوری نہیں کرتا میں نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا ہے لیکن میں تم سے کہتی ہوں کہ شریف کو بھی ایسا ہی بنانے کی کوشش کرو۔ ورنہ میں آج کل ہی میں تمہارے میاں سے اس کی شکایت کر دوں گی۔''

بوڑھیا یہ سب کہہ رہی تھی اور امّی حیران و پریشان یہ سب سن سن کر شریف کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اور شریف کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ جب بوڑھیا خاموش ہوئی تو امّی نے شریف کی طرف دیکھا۔ شریف کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے ماں کی گود میں سر ڈال دیا۔ اور رونے لگا۔ بوڑھیا اسے سمجھانے لگی۔ ''مت رو بیٹا! میں تیرے بھائی کی شکایت لے کر تیرے گھر نہ آؤں گی۔ بس اب تجھے اطمینان ہوا۔ اس کے بعد امّی سے کہنے لگی۔

''دیکھو اسے اپنے جُڑواں بھائی سے کتنی محبت ہے!''

امّی کچھ نہ جان کر بھی سب کچھ سمجھ گئیں۔ وہ جانتی تھیں کہ یہ سب شریف کی چال ہے، جس میں بوڑھیا آ گئی لیکن آج انھیں ایسا محسوس ہوا کہ شریف کے یہ آنسو توبہ کے آنسو ہیں۔ وہ بھی خاموش رہیں اور پھر سچی بات یہ ہے کہ پھر بوڑھیا کے باغ میں شریف چوری کرنے نہیں گیا بلکہ وہ بوڑھیا کی نظر میں ساجد ہی بنا رہا۔ اب وہ باغ میں بوڑھیا کی خدمت کرنے جاتا ہے، اب وہ سچ مچ شریف بن گیا۔ یعنی اسم بامسمیٰ جیسا اس کا نام ویسے اس کے کام۔

(پلاٹ ایک ہندی کہانی سے لیا گیا اور یہ کہانی پھر سے بنائی گئی)۔

کرے کون بھرے کون؟

ننھی اس وقت اپنے مکان کی ایک کھڑکی میں بیٹھی تھی۔ اس نے ایک چیخ سنی۔ اس نے دیکھا۔ جلال نے اکبر کے چھرا گھونپ دیا اور ایک طرف بھاگ گیا۔ "ہائے اللہ!" اس کی زبان سے نکلا۔ پھر اس نے دیکھا شوکت ایک طرف سے آیا۔ شوکت نے جھک کر چاہا کہ چھرا اس کے سینے سے نکالے۔

اسی وقت دو سپاہی آ گئے انھوں نے شوکت کو پکڑ لیا۔ لاش کے ساتھ شوکت کو بھی لے گئے اور پھر یہ خبر آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی کہ شوکت نے اکبر کو قتل کر دیا۔

یہ خبر ننھی نے بھی سنی۔ وہ یہ خبر سن کر ہکا بکا رہ گئی۔ کچھ دیر کے بعد وہ ذرا سنبھلی تو اس کی زبان سے نکلا "ہائے اللہ!" "کرے کون، مرے کون، بھرے کون؟" اور پھر وہ یہی رٹتی رہی۔

اس کی ماں نے اُسے یہ رٹتے سنا تو منع کیا" لیکن ننھی رٹے جا رہی تھی" کرے کون، مرے کون، بھرے کون" ماں نے اسے ڈانٹا اور جب وہ یہی رٹتی رہی تو دو ایک چانٹے رسید کیے۔ مگر ننھی یہی رٹے جا رہی تھی کہ کرے کون.....!"

شام کو اس کے ابّا گھر آئے۔ وہ اب بھی یہی رٹ لگا رہی تھی۔ اب تو ماں باپ کو فکر پیدا ہو گئی۔ پاس پڑوس کے لوگ دیکھنے آنے لگے۔ کسی نے کہا "آسیب ہے" کسی نے کہا جن سوار ہے" سب نے رائے دی کہ سیانے کو بلا کر ٹونا ٹوٹکا کیا جائے۔ ننھی کے ابّا ٹونا ٹوٹکا کرنے کو تیار نہیں ہوئے۔ وہ اسی وقت ڈاکٹر کو بلا لائے۔ ڈاکٹر نے آ کر دیکھا۔ اس نے سو جانے کا انجکشن لگا دیا ننھی سو گئی۔

بارہ گھنٹے کا انجکشن تھا۔ صبح کو بارہ گھنٹے ختم ہو گئے تو اس نے آنکھ کھولی ساتھ ہی اس کا منہ کھلا اور اس نے پھر رٹنا شروع کر دیا "کرے کون، مرے کون، بھرے کون؟" گھر کے سب لوگ پھر بے چین ہو گئے۔ ننھی کے ابّا نے پانی کی طرح پیسے بہا کر اس کا علاج کرایا۔ مگر ننھی کی رٹ کم نہ ہو۔

کئی مہینے ہو گئے۔ ننھی سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ وہ کمزور بھی بہت ہو گئی۔ لیکن اس کی زبان میں

خدا جانے کتنی طاقت تھی کہ "کرے کون، مرے کون، بھرے کون" رٹتے ہوئے اس کی زبان نہ تھکتی تھی۔

ادھر عدالت میں قتل کا مقدمہ شوکت پر چل رہا تھا۔ انہی تاریخوں میں ایک بوڑھے حکیم صاحب کو ننھی کے ابا کہیں سے لے آئے۔ حکیم صاحب دیر تک سوچتے رہے پھر انھوں نے کہا کہ جس دن یہ بیماری بچی کو لگی ہے۔ اس دن کوئی واقعہ، حادثہ، واردات یا کوئی اور بات محلے میں ہوئی تھی جسے لڑکی نے دیکھ لیا۔

گھر والوں نے سوچ کر بتایا کہ ہاں اس دن کھڑکی کے سامنے سڑک پر شوکت نے اکبر کو چھرا گھونپ دیا تھا اور وہ بے چارہ مر گیا۔ اس کا مقدمہ چل رہا ہے اور اب فیصلے کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔

یہ سن کر حکیم صاحب نے کہا۔ بس میں سمجھ گیا۔ بچی کی بیماری کا تعلّق اسی واردات سے ہے میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ اکبر کو مارا کسی اور نے ہے اور پکڑا کوئی اور گیا بچی جو رٹ رہی ہے کہ "کرے کون، مرے کون، بھرے کون، اس کا مطلب یہی ہے کہ کس نے قتل کیا اور کون پکڑا گیا۔ اچھا میں آج ہی ننھی سے باتیں کروں گا۔ میں کھانا بھی اسی کے ساتھ کھاؤں گا۔ آپ میری باتیں سنیے گا۔"

شام کو حکیم صاحب نے کھانا ننھی کے ساتھ کھایا۔ دستر خوان پر اس کے ابا بھی تھے اور پردے میں ماں۔ حکیم صاحب نے ننھی کے ابا سے کہا:۔

"کیا عرض کروں جناب! ایک بار میں نے دیکھا کہ ایک شخص نے ایک شخص کو قتل کر دیا اور بھاگ گیا۔ وہ تو پولیس کے ہاتھ آیا نہیں۔ پولیس نے ایک دوسرے بے گناہ کو پھانس دیا اور اب وہ بے چارہ حوالات میں ہے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ اب میں گواہی دینے جاؤں گا اور قتل کرنے والے کا نام بھی بتا دوں گا۔"

یہ کہانی حکیم صاحب نے سنائی تو ننھی چونکی۔ اس کی رٹ بند ہوئی اور اس نے کہا "یہی تو ہوا، یہی تو ہوا، یہی تو ہوا۔"

حکیم صاحب نے ننھی سے کہا "عدالت چلوگی، گواہی دوگی کہ کس نے مارا" اس نے کہا ہاں، جلال نے مارا۔

لیجیے صاحب مقدمہ الٹ گیا۔ بچی کو عدالت میں حاضر کیا گیا پھر سے مقدمہ شروع ہوا شوکت کو چھوڑ دیا گیا اور جلال پر دفعہ قائم ہوئی۔ ننھی اب بالکل اچھی ہو چکی تھی لیکن یہ مثل اب بھی چاروں طرف سنی جا سکتی ہے کہ کرے کون، مرے کون، بھرے کون، کیوں کہ آج کل یہی ہو رہا ہے۔